''کاروڑ'' کا گل سرسبد

مفتی شعیب عالم
استاذ و مفتی دار الافتاء جامعہ

دریائے سندھ اور ڈیورنڈ لائن کے درمیان کا علاقہ پاکستان کا سرحدی اور قبائلی علاقہ کہلاتا ہے۔ دریائے سندھ تو مشہور ومعروف دریا ہے، جبکہ ڈیورنڈ لائن وہ خطِ فاصل ہے جو برطانوی حکومت کی ایماء پر ہندوستان کو افغانستان سے متمیز کرنے کے لئے کھینچا گیا تھا، اس خط کی وجہ سے وہاں کی مقامی آبادی پاک اور افغان دو حصوں میں بٹ گئی ہے، مگر قبائل نے زمین کی تقسیم کو دلوں کی تقسیم کا ذریعہ نہیں بننے دیا۔

سیاسی لحاظ سے سرحدی صوبہ یعنی خیبر پختونخوا دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک تو آزاد قبائل کا علاقہ ہے جو مالاکنڈ، مہمند، کرم اور شمالی وجنوبی وزیرستان وغیرہ ایجنسیوں پر مشتمل ہے اور دوسرا زیرِ قانون علاقہ ہے جیسے ہزارہ، مردان، پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان وغیرہ، اس کے علاوہ کچھ پٹیاں ہیں جو انتظامی ضروریات کے تحت زیرِ قانون اضلاع کے ماتحت ہیں، انہیں ہم نیم قبائلی علاقے کہہ سکتے ہیں۔

ہزارہ ڈویژن جو دریائے سندھ کے مشرق میں واقع ہے اور جہاں سرکار کی عمل داری ہے، اس سے ملحقہ ایک نیم قبائلی علاقہ ہے جو ''کالا ڈھاکہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ہمارے ممدوح ومحبوب اور راہِ حق کے شہید مفتی صالح محمدؒ کا تعلق اسی سرزمین سے تھا۔ یہ علاقہ صدیوں سے آزاد اور خود مختار چلا آرہا تھا، قبائلی روایات اور طرزِ معاشرت کو اس نے من وعن محفوظ رکھا تھا اور یہاں کے باشندے اپنے نزاعات کا تصفیہ شریعت اور مقامی رسم ورواج کے مطابق کیا کرتے تھے۔ اس علاقے کی تاریخ بتاتی ہے کہ سکھ یہاں اپنا تسلط نہیں جما سکے، مغل بھی اسے زیر نہ کرسکے اور انگریز کو بھی یہاں لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اب یہ علاقہ باقاعدہ حکومتِ پاکستان کا حصہ بن چکا ہے اور مقامی آبادی چونکہ پشتون اکثریت پر مشتمل ہے، اس لئے ان کی زبان کی رعایت سے اس کا نام ''تورغر'' رکھا گیا ہے۔ تذکرہ اور تاریخ کی کتابوں میں اسے ''کوہ سیاہ'' اور تبلیغی جماعت کے عرف میں اسے ''بیت السلام'' کہا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر کے علاوہ سب کا مطلب تورغر یعنی کالا پہاڑ ہے۔ ''تسمیۃ الکل باسم الجزء'' درسی زبان کی ایک مشہور

اصطلاح ہے، ورنہ مجموعی لحاظ سے یہ علاقہ سبز پوشاک اوڑھے رہتا ہے، جو پہاڑ قد میں اونچے ہیں وہ موسم سرما میں سَروں پر سفید عمامے سجا لیتے ہیں۔ گرمیوں میں جب سورج تپتا ہے تو اس کی گرم شعاعیں ان پہاڑوں پر جلتی آگ کا منظر پیش کرتی ہیں۔ ان ہی پہاڑوں کے درمیان چٹانوں سے ٹکراتا، شور مچاتا اور بل کھاتا ہوا دریائے سندھ بہتا ہے جو پاکستان کا عظیم آبی ذخیرہ، زرعی حیات کا ضامن اور پرشکوہ تہذیبوں کا محافظ ہے، جس کی قدامت، وجاہت اور عظمت نے ہر دور کے شعراء، قلمکاروں اور دانشوروں سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر تاتاری نسل کے ہندو حکمراں چلے آتے تھے۔ ایک طرف مداخیل اور دوسری طرف امازئی آباد تھے۔ حضرت اخون سالاک کابل گرامیؒ جو سترھویں صدی کے بزرگ گزرے ہیں ان کی جہادی مہم کے نتیجے میں یوسف زئی قبیلے نے اُن ہندوؤں کو یہاں سے بے دخل کیا۔ اب زمانہ موجودہ میں دریا کی مشرقی سمت پر حسن زئی، چغرزئی، بسی خیل اور نصرت خیل آباد ہیں اور مغربی جانب امازئی اور مداخیل کی آبادیاں ہیں۔ مفتی صالح محمد کاروڑیؒ اسی مداخیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔

عربوں میں جس طرح قومیت اور خاندان کا شاخ در شاخ سلسلہ ہے اور اتحادِ نسب کا بعید ترین تعلق ''شعب'' سے ظاہر کیا جاتا ہے اور آخری اور قریبی حلقہ ''اسرۃ'' اور ''عائلۃ'' ہے اور درمیان میں اوپر سے نیچے آتے ہوئے شعب کے بعد ''قبیلہ'' پھر ''عمارہ'' پھر ''بطن'' پھر ''فخذ'' اور پھر ''فصیلہ'' ہے، اسی طرح قبائلی بھی ایک پیچ در پیچ اور شاخ در شاخ خاندانی سلسلے میں منقسم ہیں۔ پہلے قوم ہے، پھر قبیلہ ہے، پھر خیل ہے، پھر خاندان ہے اور خاندان گھرانوں میں تقسیم ہے۔ مفتی صاحب پشتونوں میں یوسف زئی اور یوسف زئیوں میں مداخیل اور مداخیل کی شاخ حسن خیل اور اس کی شاخ مندامانہ اور مندامانہ کی شاخ موسیٰ خیل سے تعلق رکھتے تھے۔

آپ کے گاؤں کا نام ''کاروڑ'' ہے، جو کہ اصل میں ''کہروڑ'' تھا اور ایک ہندو کا نام تھا، مگر امتدادِ زمانہ سے کاروڑ ہوگیا، اسی نسبت سے آپ کاروڑی لکھتے اور کہلاتے تھے۔ یہ گاؤں تقریباً پانچ سو گھرانوں پر مشتمل ہے اور بجلی، گیس، ٹیلیفون، سڑک اور ہسپتال جیسی ضروری اور بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔ ٹیبل نما پہاڑوں پر واقع ہونے کی وجہ سے گاؤں تک چڑھنے کا راستہ بہت دشوار گزار ہے اور ضروریاتِ زندگی سر پر اٹھا کر یا جانوروں پر لاد کر اوپر پہنچائی جاتی ہیں۔ اسی پسماندہ اور دور افتادہ گاؤں میں داوا خان بن مقتدر خان کے گھرانے میں جس بچے نے آنکھ کھولی، اسی کا نام صالح محمد ہے۔ آپ کی دو بہنیں ہیں اور تینوں بھائیوں میں آپ منجھلے تھے۔ دو بیوائیں، دو بیٹے اور تین بیٹیاں

آپ نے سوگوار چھوڑی ہیں۔

شہید مفتی صاحبؒ کا گاؤں دریائے سندھ کے کنارے آباد ہے۔ اردگرد کا ماحول انسانی مزاج کی تشکیل اور سیرت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ایک طاقتور عامل سمجھا جاتا ہے جو انسانی خد وخال سے لے کر اس کی طرزِ معیشت ومعاشرت اور جذبات وخیالات تک کو متاثر کرتا ہے۔ مفتی صاحب کی طبیعت میں اس عامل کا گہرا اثر پایا جاتا تھا۔ دریائے سندھ میں تموج اور تلاطم رہتا ہے تو اس کے فرزند کی زندگی میں بھی ایک ہیجان اور اضطراب تھا، یہ ریگ زاروں کو گلزاروں میں بدلتا ہے تو اس کے سپوت کا مشن بھی بنجر اور سوختہ زمینوں کو لہلہاتے سبزہ زاروں میں تبدیل کرنے کا تھا، اس کی تند وتیز موجیں پہاڑوں سے سرٹکرا کر آگے بڑھتی ہیں تو اس کا بیٹا بھی کسی خارجی سہارے کے بغیر محض اپنی فطری لیاقت اور ذاتی صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھا تھا۔ اے دریا...! اگر تجھ پر زرعی حیات کا انحصار ہے تو ان پر روحانی حیات کا مدار تھا، تو اگر تہذیبی اور تمدنی روایات کا امین ہے تو وہ دینی اقدار اور نبوی علوم کا محافظ تھا، چٹانیں کھسک کر تیرے پیندے میں آگرتی ہیں، مگر تو اپنا راستہ تبدیل کرتا ہے، نہ ہی تیرا ہیجان اور روانی متاثر ہوتی ہے، پھر تعجب کیا ہے کہ تیرے بیٹے نے مخالف بادِ مخالف اور نامساعد حالات کو کبھی اہمیت نہیں دی، یہ سبق تیرا ہی سکھایا ہوا تھا، اگر وہ کشادہ دل اور وسیع الظرف تھے اور سب کے لئے سینے میں جگہ رکھتے تھے تو تیرا معاون دریاؤں کو سینے سے لگانا اور انہیں دامن میں بھر کر بہنا کیا معنی رکھتا ہے؟، تو تبت سے نکل کر بحیرہ عرب میں اپنا وجود گم کردیتا ہے، اگر انہوں نے اپنی ہستی مٹادی اور جان جاں نثار کردی تو یہ خصلت تیری بدولت ان کی فطرت میں ودیعت تھی۔

دریا کو بہنے اور پھیلنے کے لئے وسیع رقبہ چاہئے تو دریا صفت انسان کو بھی کام کا وسیع میدان چاہئے ہوتا ہے۔ پانی پڑے پڑے گدلا ہوجاتا ہے، مشینری زنگ آلود ہوجاتی ہے، صلاحیت بھی اگر آزمائی نہ جائے تو مرجھا جاتی ہے۔ مفتی صالح محمدؒ جس قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ان کے مزاج میں انفرادیت پسندی ہے، دنیا سے ان کا ربط وضبط کم ہے اور پہاڑوں نے انہیں باقی دنیا سے الگ تھلگ رکھا ہے، وہ ان پہاڑوں کو شدت سے چاہتے ہیں، اپنے حال پر نازاں، ہمہ دم فرحاں اور سدا بہار شاداں رہتے ہیں۔ بعض قبائلی بوڑھے ایسے ہیں جنہوں نے آج تک اپنے علاقے سے باہر قدم نہیں رکھا ہے، ان باتوں کا تقاضا تھا کہ آپ تمام عمر بے نام اور گمنام رہتے اور آپ کو اپنی فطرت میں ودیعت صلاحیتیں آزمانے کا موقع ہی نہ ملتا، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرمایا اور آپ کو اس نعمت سے نوازا جس کا احسان اس نے خاندانِ یوسف علیہ السلام پر یہ کہہ کر جتلایا ہے کہ ہم تمہیں دیہات سے لے آئے ''وجاء بکم من البدو''۔ (یوسف:۱۰۰)

دیہات سے شہر آنے کا حقیقی سبب تو وہی ہے جو اوپر بیان ہوا، مگر اس کا ظاہری سبب وہ رسم ہے جو صدیوں سے قبائل میں رائج ہے اور ابتدائی اسرائیلی عہد کی یادگار ہے، جس کے تحت قبیلہ اور اس کے تحتی افراد کے درمیان وقتاً فوقتاً زمین کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ رسم ''ویش'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پسِ پشت فلسفہ یہ ہے کہ ہر خاندان اور خاندان کا ہر فرد کچھ عرصے کے لئے بہترین زمین سے متمتع ہو سکے، تاکہ اقتصادی قوت کے بل بوتے پر سیادت کے ارتقا کو روکا جا سکے۔ گویا زمین کی عارضی تقسیم کا نام ''ویش'' ہے۔

قبائل جب ان زمینوں پر پہنچے تھے تو انہوں نے زمین کی تقسیم کا یہ منصفانہ نظام وضع کیا تھا، اس نظامِ اراضی کے تحت تقریباً آدھی زمین شاملات یعنی مشترکہ چراگاہ کے طور پر چھوڑی گئی اور بقیہ تمام خیلوں میں برابر تقسیم کر دی گئی اور خیل کا حصہ اس کے مختلف خاندانوں میں بانٹ دیا گیا۔ وراثتی نظام کے تحت پشت در پشت منتقلی اور خاندان کے پھیلاؤ اور ان میں تقسیم کی وجہ سے فرد کا حصہ اتنا قلیل رہ گیا کہ گزراوقات اس پر مشکل ہوگئی، نتیجۃً قبائل کے افراد ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ تعجب خیز امر یہ ہے کہ عموماً یہ تبادلے بلاکشت وخون ہوتے ہیں اور کبھی زمین اور چراگاہوں کے ساتھ رہائش گاہیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ دس پندرہ سال قبل حسن زئی قوم میں اسی قسم کی تقسیم ہوئی تھی۔ اس رسم سے کمال واقفیت مفتی صاحب کے لئے اراضی اور شاملات کے متعلق نزاعات کے تصفیے میں بہت آسانیاں پیدا کرتی تھی۔

بہر حال ہجرت کی وجہ جو بھی ہو، مفتی صاحب پانچ سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ کراچی منتقل ہوئے۔ اولین رہائش نرسری کے علاقے میں ایک ڈیرے میں تھی، اسی علاقے میں تیسری جماعت تک تعلیم حاصل کی، آپ کے والد کا بیان ہے کہ میں موم بتی کی روشنی میں انہیں پڑھایا کرتا تھا۔ نرسری سے آپ قصبہ کالونی منتقل ہوئے اور مدرسہ اشاعت القرآن میں ناظرہ پڑھنا شروع کیا، قاری سلطان عمر صاحب دینی علوم میں آپ کے اولین استاد ہیں، اس کے بعد جامعہ ربانیہ میں ثانیہ تک کی کتب پڑھیں، اس دوران آپ کی والدہ ماجدہ بھی گاؤں سے کراچی تشریف لے آئیں۔ چھٹیوں میں دورہ تفسیر کے لئے شاہ پور چلے گئے اور ارادہ سوات میں درس نظامی کی تکمیل کا تھا، مگر والد صاحب راضی نہ ہوئے اور بادل نخواستہ کراچی واپس آنا پڑا۔ رابعہ تک مخزن العلوم بنارس میں پڑھا اور خامسہ سے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخلہ لیا اور یہیں سے ۱۹۹۳ء میں سند فراغت حاصل کی، جامعہ کے استاد اور جامع مسجد بنوری ٹاؤن کے امام مولانا سید یوسف حسن طاہر الحسینی اور جامعہ کے مدرس مولانا قاری زبیر احمد صاحب اور مولانا عزیز الحق صاحب (حال مقیم برطانیہ) آپ کے ہم درس اور ہم سبق رہے ہیں۔ جامعہ ہی سے مفتی نظام الدین شامزئی شہیدؒ اور مفتی عبدالسلام چاٹگامی مدظلہ العالی کے زیر

سا یہ افتاء کی مشق کی اور تخصص کی سند حاصل کی۔آپ کی تشنگی دوسالہ تخصص سے دور نہیں ہوئی، اس لئے چار سال مزید فتوی نویسی کی مشق کے لئے آتے رہے، حالانکہ حضرت قاری ضیاء الحق صاحب کے مدرسے جامعہ تعلیم القرآن متصل الفلاح مسجد میں بہ حیثیت مدرس آپ کا تقرر ہو چکا تھا۔

حضرت مفتی نظام الدین شامزیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''لڑکے صرف فاضلِ وفاق ہونے کو کافی سمجھتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ دنیا ان کی قدر نہیں کرتی''۔ یہ فرمانے کے بعد روئے سخن مخاطبین کی طرف کر کے فرماتے تھے: ''تم اپنے اندر کمال پیدا کرلو اور پھر آبادیوں سے دور نکل جاؤ اور کسی اونچے پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ جاؤ، دنیا تمہیں وہاں بھی ڈھونڈ نکالے گی، المیہ یہ ہے کہ لوگ کمال اور صلاحیت پیدا کئے بغیر دنیا سے ناقدری کی شکایت کرتے ہیں۔'' یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ جوہر شناس نگاہوں اور کمال کی قدردان شخصیتوں سے آپ اوجھل رہ جاتے، اس لئے ۱۹۹۸ء میں جامعہ کے دارالافتاء میں بہ حیثیت مفتی آپ کا تقرر عمل میں آیا۔

جامعہ میں خدمتِ افتاء کے ساتھ آپ جامعہ درویشیہ میں تخصص کے نگراں اور مشرف تھے اور وہاں دورہ حدیث میں ترمذی شریف کا درس بھی آپ کے سپرد تھا، اس کے علاوہ جامعہ احیاء العلوم پیر کالونی بھی ایک آدھ گھنٹے کے لئے تشریف لے جاتے۔ شہادت کے سال جامعہ میں اصول فقہ کی کتاب نورالانوار آپ کے زیرِ تدریس تھی۔

حضرت شہیدؒ نام کی بجائے کام اور دعووں سے زیادہ عمل پر یقین رکھتے تھے۔آپ کی باتوں میں تو تقریر کا زور اور فصاحت وبلاغت کا جوش نظر نہیں آتا تھا اور زبان میں بھی کسی قدر علاقائیت کی جھلک تھی، جس کی بناء پر آپ کی حقیقی شخصیت پردہ خفاء میں رہتی اور نو وارد آپ کے متعلق درست رائے قائم کرنے میں غلطی کر جاتا تھا، مگر آپ کے ہاں عملیت تھی اور بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ کے اسی کی دنیا کو ضرورت ہے ورنہ دلکش نعروں، بلند بانگ دعووں، میٹھی میٹھی باتوں، مؤثر تمثیلوں اور دل آویز حکایتوں کی یہاں کمی نہیں۔آپ کی اسی عملیت پسندی کا نمونہ آپ کی قائم کردہ جامع مسجد نور اور اس سے ملحقہ جامعۃ النور الاسلامیۃ ہے۔ مدرسے میں سات سو کے لگ بھگ بچے حفظ وناظرہ کی تعلیم حاصل کررہے ہیں جس میں اَسّی (۸۰) کی تعداد سایۂ پدری سے محروم یتیم بچوں کی ہے۔خود آپ کی زندگی عسرت اور تنگی میں گزری ہے، جس کی ایک وجہ قلیل پر قناعت اور نزاع کے خوف سے اپنے حق سے دستبرداری بھی ہے۔ شہادت سے کچھ ہی عرصہ قبل قرض کے بار سے سبکدوش ہوئے تھے، مگر ان بچوں کے لئے آپ کے ہاں بہت کچھ تھا، خود ان کے دروازے پر جا کر ان کو ضروریات مہیا کرتے تھے۔نجی مجلس میں فرمایا کرتے تھے کہ مجھے مکتب اور مدرسے اور ان معصوموں کی بدولت اللہ تعالیٰ سے نرمی کی

امید ہے۔ اسی جذبے کے تحت آپ نے ایک مطلقہ سے عقد ثانی فرمایا تھا اور اس کے پہلے شوہر سے بچے بھی اپنے زیر کفالت اور زیر تربیت لے لئے تھے۔

عام زندگی میں آپ سادگی پسند اور جفاکش دکھائی دیتے تھے۔ طبیعت کے ہنس مکھ اور خوش مزاج تھے۔ قد درمیانہ، بدن ٹھوس اور جسم چست وچابک تھا جس کی وجہ وہ ماحول تھا جس میں محنت اور جفاکشی کے بغیر گذارا مشکل ہے۔ محنت اور غیرت، خودداری اور خوداعتمادی آپ کے خون میں شامل تھی۔ اپنی دنیا کے آپ بادشاہ اور دوسروں کی بے جا اطاعت سے ناآشنا تھے۔ اپنے کام میں مگن، اردگرد کی غیر تعلیمی سرگرمیوں سے لاتعلق اور نمایاں ہونے کے شوق سے قطعاً نابلد تھے۔ میلے ٹھیلوں اور غیر ضروری بھکیڑوں میں الجھنے کی آپ کو فرصت نہ تھی۔ بڑوں سے مؤدبانہ، رفقاء سے دوستانہ اور چھوٹوں سے مشفقانہ اور خیر خواہانہ رویہ رکھتے تھے، وقت کے پابند تھے، سردی ہو یا گرمی، حالات پرامن ہوں یا گولیوں کی گھن گرج ہو، مفتی صالح محمد اپنی نشست پر موجود ہوتے تھے۔ گھریلو کام خود انجام دینے کے عادی تھے، پچاس کلو کی بوری خود ہی اٹھا کر گھر لایا کرتے تھے۔ اپنا ذاتی مکان تعمیر کیا تھا جس کا نقشہ، کٹنگ، شیٹرنگ اور مہارت کے متقاضی تمام کام خود انجام دیئے تھے، صرف تعمیری ساز وسامان کے لانے، اٹھانے، ملانے وغیرہ کے کام اجرت پر کرائے تھے۔ رات کے اوقات میں ایک ماربل فیکٹری میں تشریف لے جاتے، وہاں کے منتظم کریم صاحب کا بیان ہے کہ اپنی ذکاوت اور ذہانت کی بدولت مفتی صاحب کچھ ہی عرصہ میں نوے فیصد کام جان گئے تھے۔ اہل علاقہ اور آپ کے درمیان کوئی فاصلے نہیں تھے۔ تخصص کے جو طلبا فارغ ہوکر جاچکے ہیں، وہ مسلسل آپ سے ربط میں رہتے تھے اور آپ ان کی معاونت اور رہنمائی فرماتے اور انہیں مفید مشوروں سے نوازتے تھے، شام کے اوقات میں اسی وجہ سے آپ کا فون بہت مصروف ملتا تھا، منٹوں اور سیکنڈوں کو مادیت کے ترازو میں تولنے والی ذہنیت کے نزدیک آپ کا یہ عمل اوقات کا ضیاع تھا، مگر جس کا مقصد ہی ہمہ وقت خیر کا فیضان ہو اس کے لئے یہ باتیں بے معنی تھیں۔

جو علمی سرمایہ آپ نے یادگار چھوڑا ہے ان میں فقہ کی مشہور کتاب ''کبیری'' پر آپ کے تعلیقات اور اضافہ عنوانات ہیں۔ مرحوم شہید اپنی حیات میں اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے، اللہ کرے زیور طبع سے آراستہ ہوجائے۔ کبیری پر کام کا آغاز دوران حج حرم مدنی میں کرلیا تھا۔ کفایت المفتی اور فتاوی رحیمیہ آپ کی تخریج شدہ متداول ہیں۔ فتاوی دارالعلوم دیوبند کو ابواب پر مرتب کیا تھا۔ فتاوی محمودیہ پر کسی قدر کام کیا تھا، مگر کسی عارض کے سبب سے روک دیا تھا۔ سب سے اہم استنساخ (کلوننگ) کے موضوع پر آپ کی کتاب ہے، جو اپنے موضوع پر نہایت قیمتی معلومات، پرمغز تبصروں اور جدید طبی اصولوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مواد کے جمع کرنے میں غیر معمولی محنت

اٹھائی گئی ہے۔ کسی کو ان کی آراء اور قائم کردہ فیصلوں سے اختلاف ممکن ہے، مگر وہ مؤلف کی تحقیق اور دلائل کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اس موضوع پر اردو زبان میں اس سے بہتر، معلومات آفریں اور محققانہ کتاب شاید ہی کوئی ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تمام کام فراغت کے بعد ابتدائی یا زیادہ سے زیادہ درمیانی سالوں کا ہے، آخری سالوں میں کچھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ متروک تھا، حالانکہ تحقیق وتصنیف کا ذوق رکھتے تھے، قلم وقرطاس سے تعلق کے انقطاع پر حزین تھے اور اپنے علمی منصوبوں کی عدم تکمیل کا حسرت سے ذکر کیا کرتے تھے۔ تصنیف وتالیف کا یہ سلسلہ جاری کیوں نہ رہ سکا، رفتار کم بلکہ ختم کیوں ہوئی؟ اب اس کا ذکر فائدہ تو کوئی نہیں رکھتا، البتہ غم میں مزید اضافے کا سبب ضرور ہے۔

فقہ کے علاوہ سیاست اور اس کا خاص باب بین الاقوامی تعلقات آپ کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اس موضوع پر گفتگو کے وقت معلوم ہوتا تھا کہ کسی یونیورسٹی میں آئی آر کا پروفیسر اس موضوع پر لیکچر دے رہا ہے۔ خطے کی صورت حال، داخلی حالات اور مستقبل کے امکانات پر اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ اقوام عالم میں افغان قوم کے متعلق اقبال کے نظریے ''افغان باقی کہسار باقی'' سے متفق تھے۔ پاکستانی قوموں کی عادات وخصائص اور ان کی اصل ونسل کو بیان کرتے ہوئے شاخ در شاخ تقسیم کرکے بالکل تحتانی درجے تک پہنچ جاتے تھے۔ کسی مبالغہ اور رنگ آمیزی کے بغیر بعض قوموں کے متعلق اتنی واقفیت رکھتے تھے کہ وہ خود اپنے آپ کے متعلق بھی اتنا نہیں جانتی ہوں گی۔

ان سطور کی تحریر کے وقت مفتی صالح محمدؒ کی شہادت کو ایک مہینے سے زائد ہوگیا ہے، مگر دل اب بھی اسے ایک حقیقتِ واقعہ کے طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں ہے اور کیسے تسلیم کرلے جبکہ جذبات سے عاری اور داخلی احساسات سے خالی بے جان اشیاء میں بھی صرف جسمانی قربت سے ایک تعلق پیدا ہوجاتا ہے اور ایک کے الگ کرنے سے دوسرا مزاحمت کرتا ہے، انسان تو پھر انسان ہے، سینے میں دل اور دل میں جذبات رکھتا ہے۔ ہم زبان کو شہداء کی یاد سے بند رکھیں یہ تو طاقت میں ہے مگر دل پر کس کا زور چلتا ہے اور سوچ پر کیسے پہرے بٹھائے جاسکتے ہیں؟ جبکہ پورا کا پورا ماحول ان کی یاد دلاتا ہے، جب ان کی نشست کی طرف نگاہ اٹھتی ہے تو چشم تخیل میں وہ بیٹھے نظر آتے ہیں، لوگوں کا مجمع ان کے اردگرد لگا ہوا ہے، زبانی دریافت کرنے والے سامنے جبکہ تحکیم کے لئے تشریف لانے والے ٹولیاں بنائے انتظار میں بیٹھے ہیں، ہجوم اتنا ہے کہ برابر میں استاذ محترم مفتی عبدالقادر صاحب کو اپنی نشست تک پہنچنے میں دقت ہورہی ہے، آوازیں اتنی بلند ہورہی ہیں کہ رفقاء کا کام متاثر ہورہا ہے اور انہیں بار بار آواز پست رکھنے کی تلقین کی جارہی ہے، فون ابھی رکھا نہیں کہ دوبارہ بجنے لگتا ہے، دائیں طرف خواتین پردے میں اپنا دکھڑا سنارہی ہیں تو سامنے کاغذات کا ڈھیر لگا پڑا ہے، کچھ فتاوی دستخط کے

منتظر تو کچھ تصحیح طلب، طلبہ کچھ کا غذا ٹھاتے ہیں اور اس سے زیادہ رکھ دیتے ہیں، اس دوران پوچھنے والے کو جوابات، طلبہ کو ہدایات اور سامنے کاؤنٹر والوں کو احکامات دیئے جارہے ہیں۔

اس قدر کام کا دباؤ کہ ذہن ماؤف اور اعصاب جواب دے جائیں اور انسان سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دور نکل جائے، مگر وہ اللہ کا بندہ نہ تھکتا ہے نہ ضبط نفس کھوتا ہے اور نہ مزاج میں کوئی چڑ چڑا پن پیدا ہوتا ہے، زیر تربیت طالب علم کی کسی فحش غلطی کی وجہ سے اگر تھوڑی دیر کے لئے طبیعت میں کوئی جھنجھلاہٹ پیدا بھی ہوتی ہے تو فوراً اس پر قابو پالیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ذہنی اور دماغی کام خصوصاً فتوی نویسی جیسی نازک اور حساس ذمہ داری پر سکون علمی ماحول چاہتی ہے، مگر وہ یہاں مفقود ہے جس کی وجہ وہی کثرت سے لوگوں کی مراجعت ہے۔ مفتیان کرام کتابوں کے درمیان براجمان ضرور ہوتے ہیں، مگر کام کے اوقات میں ان کتابوں کو چھونے کی نوبت کم ہی آتی ہے، صرف سابقہ تجربات اور پچھلی معلومات کے سہارے کام چلانا پڑتا ہے۔

فتویٰ ایک طرح کی نیم عدالتی کاروائی ہے۔ مفتی عدالتی کارروائی میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح کی نیم عدالتی کارروائی میں صورت حال اس وقت بہت نازک ہوجایا کرتی ہے جب فریقین غصے سے مغلوب ہوجاتے ہیں، پہلے تو صرف آوازیں بلند ہوتی ہیں، پھر گالم گلوچ شروع ہوجاتی ہے اور بالآخر ایک دوسرے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر مفتی صاحب ایسے ماحول کا ذرا برابر اثر نہیں لیتے تھے، ان کا ذہن مسلسل اپنے ہدف پر مرکوز رہتا تھا۔

قبائلی علاقوں کے سوالات خاص دلچسپی سے آپ حل کرتے تھے، جس کی وجہ ان کے ماحول، رسم ورواج اور عرف وعادات سے آپ کی واقفیت تھی۔ بدل، ننواتی، شرمالہ، تور، توئی، ویش، جغ وغیرہ رسومات سے اور میاں، آستانے دار، ملا، تورے دار وغیرہ اقوام کی تقسیم سے ایسے واقف تھے جیسے پوری زندگی ان ہی کے درمیان گزری ہو۔ میں تو صرف یہ دیکھ کر حیران ہوجاتا تھا کہ آپ مختلف بولیاں سمجھتے کیسے ہیں؟۔ مہینے ڈیڑھ پہلے ایک سوال آیا کہ میں نے نذر مانی ہے کہ ''کفارت'' کے روزے رکھوں گی، آپ نے جواب میں دو مہینے مسلسل روزے رکھنا تحریر کیا، اس پر کچھ اختلاف رائے ہوا، طے یہ ہوا کہ عرف کی تحقیق کی جائے، جب ایسا کیا گیا تو حقیقت وہی نکلی جو آپ نے تحریر کی تھی۔ کسی جرگے کا فیصلہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تو اس نظر سے دیکھتے کہ آیا جرگے نے حق وباطل اور جائز ناجائز کا فیصلہ کیا ہے یا صرف صورتحال کو پرامن رکھنے کی کوشش کی ہے یا صرف قبائلی روایات بیان کرکے مسئلہ نمٹا دیا گیا ہے۔

کسی سوال کے جواب میں جب ضرورت محسوس کرتے وضاحت طلب کرتے، مگر انداز ایسا اختیار کرتے تھے کہ سوال کا منشا ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، جس سے سائل آپ کے ذہن کو پڑھنے سے قاصر رہتا تھا۔ نوآموز لوگ تنقیح لیتے ہوئے جواب بھی سمجھا دیتے ہیں اور جواب معلوم ہونے کے بعد لوگ

اسی کے مطابق وضاحت دیتے ہیں۔ دیانت عام ہوتی تو ایسا کرنے میں حرج نہیں تھا، مگر جس کرپٹ معاشرے میں ہم جی رہے ہیں اس میں تنقیح کے ضمن میں اصل مسئلہ بتادینا لوگوں کے حقوق ضائع کرنا ہے۔ مدعی یا مدعی علیہ پر بھی اگر فیصلے سے پہلے فیصلے کے آثار ظاہر ہوجائیں تو وہ فیصلے کے ڈر سے تاخیری حربے یا کارروائی کو سبوتاژ کرنے یا منصف بدلنے یا پھر کم از کم اس کی نیت پر شک کرنا شروع کردیتا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم تحکیم طلب مسائل کی بھی سماعت فرمایا کرتے تھے، اس خدمت کو جس احسن طریقے سے انہوں نے نبھایا اس کی وجہ ''تنازعات کے تصفیہ'' کا وہ خداداد ملکہ تھا جو حق تعالیٰ نے انہیں مرحمت فرمایا تھا۔ ان کی یہ صفت ہمارے لئے باعث رشک اور ان کے لئے قابل فخر تھی۔ ظاہر میں یہ ایک وحدانی صفت ہے، مگر حقیقت میں کئی صفات کا مجموعہ ہے، مثلاً کسی تنازع کے حل کے لئے اولین شرط معاملہ فہمی ہے۔ مفتی صاحب اس قدر زیرک اور معاملہ فہم واقع ہوئے تھے کہ سرسری سی سماعت کے بعد مسئلے کی جڑ تک پہنچ جاتے تھے، مگر ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ تھا کہ فیصلہ واضح ہوجانے کے باوجود اسے جلد صادر نہیں فرماتے تھے، بلکہ حتی الامکان صلح وصفائی اور مصالحت کی کوشش کرتے تھے، فریقین کو بار بار اس کا موقع دیتے تھے، اس سلسلے میں وقت کا سوال ان کے نزدیک غیر اہم تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ اہل معاملہ گلے مل کر اور خنداں وفرحاں ان کے پاس سے رخصت ہوتے تھے۔

ثالث کا کردار ادا کرتے وقت الفاظ سے زیادہ معانی اور تعبیر سے زیادہ مقصود پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ بعض لوگ دعویٰ لے کر آتے ہیں، مگر ان کا مقصد کسی نئے حق کا حصول نہیں، بلکہ اپنے موجودہ حقوق کو مدعی علیہ کی مداخلت سے محفوظ کرنا ہوتا ہے، گویا وہ اقدام کے پردے میں دفاع چاہتے ہیں، مگر صاف لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ کبھی مدعی کا ظاہری دعویٰ کچھ ہوتا ہے، مگر اصل مطلوب کچھ اور ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی طلاقت لسانی اور زور بیانی سے منصف کا ذہن متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر ایسی کوئی کوشش یا چالاکی ان کے سامنے کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ سماعت کے خاتمے پر جو فیصلہ تحریر فرماتے تھے، اس میں واقعات کا خلاصہ، فیصلہ طلب امور، متنازع امور کا فیصلہ، فیصلہ کی وجوہات اور شہادات وغیرہ سب کا بیان ہوتا تھا، ایک عدالتی فیصلے کی پوری روح اور حقیقت اس میں موجود ہوتی تھی، صرف اصطلاحات کا بیان رہ جاتا تھا۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ تحکیم کے شعبہ کو وسعت دی جائے اور اسے ایک منظّم ادارے کی صورت میں سامنے لایا جائے، زمانے کو اس کی ضرورت ہے، شریعت اسے تسلیم کرتی ہے، دورِ نبوت میں اس کا ثبوت ملتا ہے، قضاء کا یہ اہم باب ہے۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، عکاظ کے میلے میں نزاعات کو فیصل کرنے کے لئے ثالث مقرر ہوا کرتے تھے۔ خود ہمارے ہاں قانون ثالثی کے نام سے جو قانون رائج ہے، اس کی رو سے اگر جانبین یہ معاہدہ کرلیں کہ ہم آپس میں

پیدا شدہ تنازع کا فلاں سے فیصلہ کرائیں گے تو تمام عدالتوں کا اختیارِ سماعت ختم ہوجاتا ہے، مگر بدقسمتی یہ ہے کہ قانون ثالثی وہی قانون ہے جو پورا کا پورا انگلستان کا ہے اور اٹھا کر یہاں نافذ کردیا گیا ہے۔ ساٹھ سال میں ہم اس میں کوئی ترمیم بھی نہیں کرسکے ہیں اور جہاں کی ہے وہاں اسے بہت الجھا دیا ہے۔ اگر تنازعات کے تصفیہ کے اس متبادل نظام کو منظّم اور مرتب کیا جائے تو یہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی خدمت ہوگی۔ لوگ مروجہ عدالتی نظام سے مایوس ہوچکے ہیں، ضرورت پڑنے پر بھی عدالت کا سہارا لینا پسند نہیں کرتے ہیں، کیونکہ وہاں وقت اور پیسہ بہت خرچ ہوتا ہے، نظام طویل اور پیچیدہ ہے اور یہاں کے کلچر اور ثقافت کے خلاف ہے، نتیجہ یہ ہے کہ دیوانی مقدمے کے بعد فوجداری مقدمہ شروع ہوجاتا ہے اور ایک مرتبہ عدالت جانے کے بعد پھر وہاں سے نکلنا دشوار ہوجاتا ہے۔ گورنمٹ قانون پر قانون بناتی ہے، مگر اصل مسئلہ قانون کی روح کے مطابق اس پر عمل درآمد کا ہے، قانون بذاتِ خود اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت وہ ہاتھ رکھتے ہیں جو اسے نافذ کرتے ہیں، ایسے ہاتھ کرپٹ اور بدعنوان ہیں۔ بالائی عدالتوں میں کرپشن کم ہوئی ہے، لیکن عوام کا زیادہ تر واسطہ نچلی سطح کی عدالتوں سے پڑتا ہے۔ اگر کسی کے حق میں دعوی ڈگری ہوجائے تو اس کے بعد اہم مرحلہ اس کے نفاذ کا آتا ہے، یہاں آکر کمزور بے بس ہوجاتا ہے، ایک بڑھیا کس طرح ایک طاقتور مافیا سے قبضہ چھڑا سکتی ہے؟ اور اگر نہیں چھڑا سکتی تو کاغذ کا وہ پرزہ اس کے کس کام کا ہے؟ ایک محترم جج صاحب کے بقول ہمارے ہاں انصاف پانے کے لئے عمرِ نوح، صبرِ ایوب، گنجِ قارون اور حیاتِ خضر چاہئے۔

عدل وانصاف آسمانی کتابوں کا مقصد اور پیغمبروں کی تعلیم وتبلیغ کا حصہ رہا ہے، اس نظامِ عدل کا ایک جزء تحکیم بھی ہے اور تحکیم کے احیاء واصلاح کی ہمیں قدرت بھی ہے، اس لئے اس موضوع پر گفتگو ذرا طویل ہوگئی، ورنہ اصل مقصود تو مرحوم شہید کے طریقۂ انصاف کو بیان کرنا تھا۔ وہ انصاف کرتے تھے اس لئے ان کے ساتھ بھی انصاف ہوگا۔ یہاں اگر عدالتِ انصاف نہیں لگتی تو عن قریب ایک بڑی عدالتِ انصاف لگنے والی ہے، مفتی صالح کو وہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ''لہو پکارے گا'' کا شاعرانہ تخیل اس دن حقیقت کا روپ دھارے گا اور وہی دن ہوگا جب صحیح معنی میں سینے کی جلن اور کلیجے کی تپش ٹھنڈی ہوگی۔

اس دنیا میں ہماری تسکین اور ہمت افزائی کے لئے شہید کے والد کے وہ وجد آفریں، ایمانی قوت سے بھرپور اور جذبۂ تسلیم ورضا میں ڈوبے ہوئے کلمات کافی ہیں جو انہوں جواں سال اور خون میں لت پت بیٹے کے لاشے کو دیکھ کر کہے تھے کہ ''مجھے فخر ہے کہ میرا بیٹا خاندان کا پہلا عالم تھا، خاندان کا پہلا مفتی تھا اور اب یہ اعزاز بھی مجھے حاصل ہوگیا ہے کہ میرا بیٹا اپنے خاندان کا پہلا شہید ہے''۔

☆☆......☆☆